مذاکرہ

بنک کے سود کا مصرف

اسلامی تہذیب کی تشکیل نو کے لیے فقہ اسلامی کی تشکیل نو ناگزیر ہے۔ علامہ اقبال نے سید مودودی کو اسی مقصد کے لیے دارالاسلام منتقل ہونے کی دعوت دی تھی۔ خصوصاً عصر حاضر میں، نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ تمدن میں، سیاست میں، اقتصادیات میں، سیاسی معیشت میں، معاشرہ میں، خاندان میں، طب میں، غرض زندگی کے ہر دائرے میں۔ بہت سے قدیم مسائل کی بھی ماہیت اور صورت بالکل بدل چکی ہے۔ مسئلہ نہیں بدلا ہے، تو حالات و زمانہ یکسر بدل گئے ہیں۔ ان حالات میں فقہ اسلامی کی تشکیل نو کو ملت کے ایجنڈے پر سرفہرست ہونا چاہیے۔

یہ کام کرنے کے لیے، سلف کی طرح، مجتہدین مطلق نہ موجود ہیں نہ پیدا ہوتے نظر آرہے ہیں۔ اجتہاد کی ضرورت جتنی شدید ہے، اجتہاد صحیح کی صلاحیت اتنی ہی قلیل ہے۔ بہرحال اہل علم جیسے کچھ بھی ہیں، ان کا فرض ہے کہ غور و فکر کریں، باہم سر جوڑ کر بیٹھیں، اظہار رائے کریں، حل تلاش کریں، حل پر متفق نہ ہو سکیں تو کم سے کم اختلاف کرنے کے حق پر اتفاق کو ضائع نہ کریں، تحمل اور رواداری اختیار کریں، تکفیر نہ کریں، لیبل نہ چسپاں کریں، ہر اختلاف کرنے والے کا احترام کریں۔ یہی سلف کا طریقہ تھا، یہی خلف کا ہونا چاہیے۔

خوشی کی بات ہے کہ بھارت میں، ہر مکتب فکر کے علما تقریباً آٹھ سال سے مختلف مسائل پر فقہی سیمی نار منعقد کر رہے ہیں، مقالات پیش کر رہے ہیں، بحث مباحثہ کر رہے ہیں، اور اختلاف و اتفاق کے نکات پر متفقہ اعلامیے جاری کر رہے ہیں۔ یہ مقالات و مباحث شائع بھی ہو رہے ہیں اور اب تک اسلامک فقہ اکیڈمی (بھارت)، دہلی، پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۵، نئی دہلی ۲۵ سے سات مجلّات شائع ہو چکے ہیں۔ ہم اس سے پہلے "اعضا کی پیوند کاری" کے مسئلہ پر، ان مقالات سے مرتب کردہ ایک مذاکرہ پیش کر چکے ہیں (ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۵)۔ اب انھی مقالات سے مرتب کردہ، دوسرا مذاکرہ "بنک کے سود کا مصرف" پیش کیا جا رہا ہے۔

مسئلہ زیر بحث بھی عملی طور پر ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایک طرف سود کے بارے میں شدید وعید قرآنی ہے، اعلان محاربہ ہے۔ دوسری طرف آج کی معیشت سود کے شکنجے میں کسی ہوئی ہے اور شاید کسی کو بھی بنک

کے استعمال سے مفر نہیں۔ جن مفروضات پر اب تک فتاویٰ دیے جاتے رہے ہیں، ان میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔ اب بنک میں چھوڑے ہوئے سود کا مصرف لازماً اسلام کے خلاف ہونا ضروری نہیں، اس لیے کہ یہ نظام خود مسلمان چلا رہے ہیں۔ اسلامک ڈویلپمنٹ بنک کے پاس سود کی بڑی رقم ہوتی ہے جو وہ اپنی دانست میں کارخیر میں خرچ کرنا چاہتا ہے۔ پھر کرنٹ اکاؤنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کی بحث بھی نظری رہ گئی ہے۔ جو پیسہ بنک کے پاس ہوتا ہے، کسی بھی اکاؤنٹ میں ہو، اس سے وہ "نفع" کماتا ہے۔ کرنٹ اکاؤنٹ کی صورت میں تعاون عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان زیادہ شدید ہوتا ہے--- خواہ رقم جمع کرانے والا قانوناً سود کے کاروبار سے بچ جائے۔ اس لیے کہ یہ "نفع" سب بنک کے پاس رہتا ہے۔ اور اب اکثر ممالک میں کرنٹ اکاؤنٹ پر بھی سود دیا جانے لگا ہے اس لیے کہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ صریح ناانصافی ہے کہ بنک کرنٹ اکاؤنٹ والے کا پیسہ استعمال کرے اور اسے کچھ نہ دے۔ سیونگ اکاؤنٹ کی صورت میں کم سے کم بینک کے ساتھ تعاون اور اس کی تقویت کچھ کم ہو جاتی ہے۔

بہرحال ہمارے پیش نظر ان مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا حل پیش کرنا نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا۔ بعض قارئین کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کے سامنے صرف ایک حل لایا جائے جس کو ترجمان یقینی اور قطعی صحیح حل کے طور پر پیش کرے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اول تو اجتہادی مسائل میں اختلاف، بلکہ متضاد فتاویٰ سے کوئی مفر نہیں۔ یہ اختلاف، اجتہاد کا فطری تقاضا ہے۔ یہ عہد صحابہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ دوسرے، ترجمان کی حیثیت نہ مجتہد کی، نہ قاضی کی۔ یہی مسلک صاحب ترجمان رحمت اللہ علیہ کا تھا اور وہ اسی پر کاربند تھے۔ ہاں ان کا یہ مقام تھا کہ وہ اپنی رائے بھی ظاہر کر دیں۔ یہ ہمارا مقام نہیں۔ لیکن اپنی رائے کو ناطق رائے کا مقام دینے سے وہ بھی اجتناب کرتے تھے۔ تیسرے، یہ بھی ان کا مسلک ہے، اور ہم اس پر کاربند رہنا چاہتے ہیں، کہ اختلاف ہو تو ساری آرا کو بیان کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے تفہیم القرآن اور رسائل و مسائل کا پڑھ لینا کافی ہو گا۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ بحث و نظر کی راہ کھلے، یہ ادراک و شعور پیدا ہو کہ اختلاف ہوا کرتا ہے، شدید بھی ہوا کرتا ہے، متضاد آرا تک بھی مجتہدین پہنچ سکتے ہیں، سلف بھی پہنچے ہیں، اور خلف بھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ قارئین یہ بھی دیکھیں اور سیکھیں کہ علما کس طرح اجتہاد و استدلال کرتے ہیں، کس طرح بحث مباحثہ کرتے ہیں، اس طریق میں کیا خوبیاں ہیں اور کیا خرابیاں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح مسائل کا شعور و ادراک بڑھے، رواداری و تحمل پیدا ہو، وسعت ظرف میں اضافہ ہو، اختلاف کی بنیاد پر فوراً تجدد پسندی، مغرب زدگی، گمراہی اور کفر و فسق کے لیبل اور فتاویٰ چسپاں کرنے کی روش ختم ہو۔

امید ہے قارئین اس مذاکرہ کو اسی حیثیت سے پڑھیں گے اور دلچسپ و مفید پائیں گے۔ (مدیر)

۱۔ مفتی نظام الدین، دیوبند

جو بینک غیر سرکاری ہوں، اس میں جمع کردہ روپے پر جو رقم سود کے نام سے ملے اس کو وہاں سے نکال کر، اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے، مسلم غربا و مساکین کو جو مستحق زکوٰۃ ہوں، بطور صدقہ

دے دے ' خود اپنے کسی کام میں نہ لائے ' اور اس کو دینے میں ثواب کی نیت نہ کرے ۔

اور جو بنک سرکاری ہوں ' ان بنکوں سے جمع شدہ رقم پر جو پیسہ سود کے نام سے ملے اس کو بھی بنک میں نہ چھوڑے ' بلکہ وہاں سے نکال کر دیکھے: اگر اپنے اوپر گورنمنٹ کا کوئی غیر شرعی ٹیکس لاگو ہو رہا ہو تو وہ رقم پہلے اس میں دے تاکہ مال اپنے مالک کے پاس لوٹ جائے ۔ پھر جو رقم بچے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غربا و مساکین کو جو مستحق زکوٰۃ ہوں ' بطور صدقہ دے کر اپنی ملکیت سے نکال دے ' اور اس کو دینے میں ثواب کی نیت نہ کرے ' کیونکہ ایسے مال کے صدقہ کرنے میں ثواب کی نیت کرنے کو محققین فقہا کفر تک فرماتے ہیں ۔

اس حکم کے دلائل کے لیے ' حرام مال کے بارے میں جو احکام کتب فقہ میں اور بذل المجهود جلد ۱ ' ص ۳۷ میں مذکور ہیں ' وہ کافی ہیں اور مزید تحقیق و تفصیل مطلوب ہو تو اعلاء السنن جلد ۱۴ ملاحظہ کی جا سکتی ہے ۔

۲۔ جناب شمس پیرزادہ ' بمبئی

بنکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا لینا جائز نہیں ہے کیونکہ سود ' سود ہے ' اور اس کا لینا خواہ وہ کسی غرض سے ہو ' جائز نہیں ۔ بنک میں رقوم جمع کرنے کے لیے دو قسم کے کھاتے کھولے جاتے ہیں ' ایک کرنٹ اکاؤنٹ ' دوسرا سیونگ اکاؤنٹ ۔ کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم پر بنک کوئی سود نہیں دیتا اس لیے اسی کو ترجیح دی جانی چاہیے ۔ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم پر بنک سود دیتا ہے ۔ یہ سود اگر بنک ہی کو چھوڑ دینا ممکن ہو تو یہی صورت اختیار کی جانی چاہیے ' کیونکہ سود کھاتے دار کی اپنی رقم نہیں ہے ' وہ صرف راس المال لینے کا حق دار ہے ۔ لہٰذا اس بات کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ بنک اس سود کی رقم کو کس مصرف میں لاتا ہے لیکن اگر سود وصول کرنا ہی پڑا تو پھر اس کا مصرف وہی ہے جو صدقہ کا مصرف ہے ' یعنی فقرا کی اعانت ۔

سرکاری بنکوں اور غیر سرکاری بنکوں سے سود لینے کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ اگر سرکاری بنکوں کے سود کو جائز قرار دیا جائے تو سرکاری لاٹری کو بھی جائز قرار دینا پڑے گا ۔ اس سلسلے میں یہ دلیل کوئی دلیل نہیں کہ حکومت عوام کی ہے اس لیے سرکاری بنک زر اصل پر جو کچھ زائد رقم دیں وہ سود نہیں ہے ' بلکہ ایک قسم کا عطیہ ہے ۔ اسلام میں مال دینے کا طریقہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اگر مال پاکیزہ طریقہ سے دیا جائے تو وہ جائز بھی ہے اور اس کے اخلاقی اثرات بھی اچھے ہوتے ہیں ۔ اگر وہی مال ناپاک طریقہ سے دیا جائے تو ناجائز بھی ہوتا ہے اور اس کے اخلاقی اثرات بھی برے مرتب ہوتے ہیں ۔ سود کے طور پر دی جانے والی رقم بہرحال جائز نہیں ہو سکتی ' خواہ باپ بیٹے کو دے ' شوہر بیوی کو دے یا حکومت اپنے شہریوں کو دے ۔

۳۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، حیدر آباد

سود کا بنک میں چھوڑنا ایک سودی کاروبار میں مزید تعاون ہے۔ اور غالباً ایسی رقوم کا استعمال کبھی ایسی مدات میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ کفر کو تقویت پہنچتی ہے، اس لیے بطریق "استحسان" اس کا نکال لینا واجب ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری بنک دونوں کا حکم مساوی ہے۔ کیونکہ سود یا "افراد" سے وصول کیا جاتا ہے یا پوری قوم سے۔ گو وہ خود بھی قوم کا ایک فرد ہے، لیکن پوری قوم کے مقابلے میں اس کا "وجود" اتنی قلیل نسبت رکھتا ہے کہ یہ دوسروں ہی سے سود حاصل کرنے کے حکم میں ہے۔ اس سلسلہ میں حد سرقہ وغیرہ کے بعض احکام سے، جن میں بیت المال کی چوری پر حد سرقہ کا نفاذ عمل میں نہیں آتا، غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ "حدود" معمولی شبہات کی وجہ سے معاف کر دی جاتی ہیں، جب کہ ربا کا معمولی شبہ "دعو الربا و الریبة" کے تحت اس کو حرام کر دیتا ہے۔

بعض بزرگوں نے اس رقم کا مصرف فقرا و مساکین کو قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مال حرام جسے اس کے مالک تک پہنچانا ممکن نہ ہو، فقہانے اسے واجب التصدق قرار دیا ہے جیسا کہ عالمگیری اور شامی وغیرہ کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ قتال اور جنگ کے علاوہ جو مال بیت المال کو حاصل ہو، وہ مسلمانوں کے مصالح عامہ پر خرچ کیا جائے گا، جیسے سرحدوں اور قلعوں کی تعمیر اور قاضی وغیرہ کی تنخواہ (ہدایہ ۲، ص ۶۰۰) صاحب درمختار نے بیت المال کی حاصل ہونے والی آمدنی اور اس کے مصارف کے سلسلہ میں محمد بن شحنہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لقطہ وغیرہ کو تمام مصالح مسلمین میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ یہی رائے امام فخر الاسلام بزدوی کی ہے کہ یہ آمدنی مساجد، سرحدات، مسافر خانے اور پلوں کی تعمیر میں بھی صرف کی جا سکتی ہے۔ (رد المختار ۲، ص ۵۸) صاحب درمختار کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ عالمگیری کی عبارت میں لقطہ کی آمدنی کو تکفین میت میں استعمال کی اجازت دی گئی ہے، اور اسے طحاوی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لقطہ اور اس طرح کی دوسری آمدنی جس کا کوئی مالک موجود نہ ہو، ایسی مدات میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے، جس میں تملیک نہ پائی جاتی ہو۔ شامی نے بزدوی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے، اور زیلعی اور صاحب ہدایہ کی نقل کو ترجیح دی ہے کہ یہ رقم فقرا پر خرچ کی جائے گی۔ لیکن زیلعی سے جو مصارف نقل کیے گئے ہیں، ان میں تکفین میت بھی ہے اور یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ میت کی تجہیز و تکفین فقہا کے نزدیک تملیک کا حکم نہیں رکھتی۔ اسی طرح علامہ سرخسی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام لقطہ سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مضاربت کے لیے

دے سکتا ہے ' اور قرض پر لگا سکتا ہے ۔

ان نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے ' یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بنک انٹرسٹ کو عام رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی اجازت ہونی چاہیے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مال لقطہ وغیرہ کو بعض فقہانے فقرا پر صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے ' لیکن وہ اس اصل پر مبنی ہے کہ صدقہ کرنے کا مقصود اصل مالک سامان کو ثواب پہنچانا ہے ۔ جب کہ بنک انٹرسٹ کے خرچ کرنے کا مقصد محض مال حرام کو اپنی ملکیت سے نکالنا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ "لاصدقة فی غلول" کے تحت اس مال میں صدقہ اور ثواب کی نیت کرنا بھی جائز نہیں ہے ۔ جلال الدین سیوطی نے بھی ایسے مال کا ' جس کا مالک معلوم نہ ہو ' مصرف مسلمانوں کی عام مصالح قرار دیا ہے ۔ اسی لیے میری رائے ہے کہ بنک انٹرسٹ تمام رفاہی کاموں میں خرچ کیا جا سکتا ہے ' البتہ مساجد کی تعمیر میں اس کا استعمال مساجد کی حرمت و عظمت کے خلاف ہے ' اس لیے اس سے منع کیا جائے گا ۔

۴ ۔ **مفتی حبیب اللہ قاسمی** ' جون پور

اگر گھر میں حفاظت کی کوئی شکل ہو تو بنک میں روپیہ رکھنا ہی نہیں چاہیے ۔ بدرجہ مجبوری رکھنے کی اجازت ہے ' اس لیے کہ بنک کا سارا نظام سودی ہے اور جتنا روپیہ دیا جاتا ہے وہ سب اس نظام کے تحت استعمال کیا جاتا ہے ' اور یہ نص قطعی ہے کہ وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان ۔ روپیہ بنک میں رکھنے کی صورت میں تعاون علی الاثم لازم آئے گا جو ممنوع ہے ۔ اسی وجہ سے حضرت گنگوہی و حضرت تھانوی نے اپنے فتاویٰ میں بنک میں روپیہ جمع کرنے کو نادرست قرار دیا ہے ۔ لیکن گھر میں غیر محفوظ ہونے کے خطرہ کے پیش نظر ' "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت رکھنے کی اجازت دی گئی ہے ۔ اس صورت میں بھی کوشش اس کی ہو کہ لاکر لے کر اس میں رکھ دیا جائے ' یا پھر کرنٹ اکاؤنٹ کھول کر اس میں جمع کر دیا جائے ۔ لیکن اگر یہ دونوں صورتیں نہیں اپنائی گئیں ' بلکہ چالو کھاتہ کھلوا کر رقم جمع کی ہے ' پھر اس پر جو سود ملے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے ' خواہ سرکاری ادارہ ہو یا غیر سرکاری ۔ اس لیے کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اسے استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی تعاون عَلَى الْاِثْمِ کے دائرہ میں داخل ہے ۔ اگر اس سے وہ اپنی عبادت گاہ نہ بھی بنائیں تو یقیناً وہ پیسہ کسی دوسرے راستے سے اسلام دشمنی پر خرچ ہو گا یا اس سے اپنی پوزیشن وہ مضبوط کریں گے جو نتیجہ کے اعتبار سے اسلام اور مسلمان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا اس لیے "اذا ابتلی ببلیتین فلیغتر اھونھما" ضابطہ کے اہون یہی ہے کہ اسے لے لے بنک میں نہ چھوڑے ۔

اب دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کہاں صرف کیا جائے ؟ اس کے مصارف کی تعیین سے قبل یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ اس مال کی حیثیت کیا ہے ؟ اس کے سود ہونے کی وجہ سے مال حرام ہونا

تو متعین ہے، اور مال حرام کا صدقہ کرنا واجب ہے (ھدایہ) - لہٰذا سود کا واجب التصدق ہونا متعین ہو گیا۔ اب اس کے مصارف تین ہیں: (۱) فقرا کو دینا (۲) غیر واجبی ٹیکس اس سے ادا کرنا۔ (۳) رفاہ عام، کنواں، نل، بیت الخلا وغیرہ میں لگانا۔

ان مصارف ثلاثہ میں سے مصرف اول یعنی فقرا کو دینا تو متفق علیہ ہے۔ اس میں اکابر و اصاغر کا کوئی اختلاف نہیں۔ چنانچہ علامہ علاوالدین حصکفی فرماتے ہیں: "مالک کا علم نہ ہو، تو فقرا ہی مصرف ہیں" (درالمختار، ج ۳، ص ۳۲۳)۔ لیکن فقرا کو دینا بھی بلا شرط نہیں، بلکہ مشروط ہے۔ اب ان شرائط کو عرض کرتا ہوں۔

۱۔ فقرا مسلمین ہوں غیر مسلمین نہ ہوں۔ اس لیے کہ جب اس کا واجب التصدق ہونا متعین ہو گیا تو واجب التصدق اموال جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ جس طرح غیر مسلم کو دینا جائز نہیں اسی طرح سود بھی غیر مسلم کو دینا جائز نہیں۔

۲۔ بلا نیت ثواب دیا جائے۔ اس لیے کہ مال حرام بہ نیت صدقہ دینا بہت خطرناک ہے۔ چنانچہ ابن عابدین شامی نے رد المختار میں، اور اسی طرح ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں تصریح کی ہے کہ ایسا کرنا کفر ہے۔ ہاں، البتہ تعمیل حکم پر ثواب ملے گا، لیکن صدقہ کرنے والا تو صرف فراغ ذمہ و سبکدوشی کی نیت سے دے دے۔ (معارف السنن، ج ۱، ص ۳۴)

مصرف ثانی غیر واجبی ٹیکس میں سود کی رقم کو دینا ہے۔ اس ملک میں بہت سے ٹیکس غیر واجبی ہیں، ان میں سود کی رقم دی جا سکتی ہے۔ اب تک ناکارہ کے علم میں اس مصرف کے بارے میں بھی کسی کا اختلاف نہیں۔ غیر واجبی ٹیکس میں دینے کی اجازت یہاں سے ملتی ہے کہ مال حرام کا مالک اگر معلوم نہ ہو اور نہ معلوم کرنا ممکن ہو تب فقرا پر تصدق واجب ہے۔ اگر معلوم ہو تو مالک کو پہنچنا ضروری ہے، اگر مالک زندہ نہ ہو تو اس کے ورثا کو دے دے۔ (درالمختار، ج ۴، ص ۲۸۳)

اس اعتبار سے مالک معلوم ہے کہ بنک حکومت کی ملکیت ہے۔ اس لیے کہ جب بنک کا نقصان ہوتا ہے تو اس کی تلافی حکومت ہی کرتی ہے۔ کھاتہ داروں سے اس کو کوئی مطلب نہیں، اور جو سود کی نفع ہوتا ہے وہ بھی فی الجملہ حکومت کے خزانہ کا ایک جز ہوتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضروری ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ہی کے ذریعے حکومت کو یہ رقم پہنچائی جائے، اسے بنک ہی میں کیوں نہ چھوڑ دیا جائے۔ اس کا جواب اس سے پہلے آ چکا ہے کہ اس کے ذریعے غیر مسلمین کی پوزیشن مضبوط کی جائے گی، یا اسے ایسی جگہ استعمال کیا جائے گا جس میں اسلام یا مسلمانوں کا نقصان ہو۔ یا پھر وہ سودی کاروبار کا جز بنے گا، یہ بھی تعاون علی الاثم کے تحت ممنوع ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ یہ تو اچھا نسخہ ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ادا کرنے کی نیت سے بنک میں

رقم جمع کرا دی جائے، اور جب سود ملے تو اس سے وہ ٹیکس ادا کر دیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل حکم تو یہی ہے کہ بنک میں رقم جمع ہی نہ کی جائے۔ لیکن بدرجہ مجبوری گھر میں حفاظت کی شکل نہ ہونے کی صورت میں بینک میں جمع کرنے کو جائز کہا گیا ہے۔ اسی وجہ سے فکس ڈیپازٹ کو ناجائز کہا گیا ہے کہ شروع ہی سے نیت سود لینے کی ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ غیر واجبی ٹیکس کی رقم حکومت کے خزانہ ہی میں جاتی ہو۔

اگر بنک غیر سرکاری ہے تو اس رقم کا غیر واجبی ٹیکس میں دینا جائز نہ ہو گا، اس لیے کہ اس صورت میں مالک کو واپس نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے غیر سرکاری بنک سے حاصل ہونے والی سودی رقم کا مصرف اول یعنی فقرا پر تصدق متعین ہے۔

مصرف ثالث رفاہی چیزوں میں سود کے پیسوں کا استعمال ہے۔ یہ مصرف شدید اختلافات کا شکار ہے۔ چنانچہ خود اکابرین کی دو طرح کی رائیں ملتی ہیں لیکن ناکارہ کے نزدیک دلیل کے اعتبار سے راجح رفاہ عام میں خرچ کرنے کا عدم جواز ہے۔ اس لیے کہ سود حرام ہے، اور مال حرام کا مالک نہ ملنے کی صورت صدقہ کرنا واجب ہے، اور صدقہ کی حقیقت زکوٰۃ کی طرح تملیک ہے۔ رفاہی کاموں میں لگانے کی صورت میں تملیک کا تحقق نہیں ہو پائے گا۔ علامہ شامی کی رائے سے بھی نیز امام کردری کے اس جزئیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو الجامع الوجیز میں ہے۔ نیز امام ابو یوسفؒ کی کتاب الاثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اکابرین اس کے قائل ہیں کہ سود کے پیسے کو مدارس کی تعمیر، کنواں، راستہ، نل، رفاہ عام میں لگانا جائز نہیں۔ اگر اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو **اذا اجتمع الحلال و الحرام فغلب الحرام یا اذا اجتمع المبیح و المحرم فغلب المحرم** سے بھی عدم جواز میں احتیاط کا پہلو ہے۔

۵۔ مولانا جنید عالم قاسمی، پٹنہ

بنک کی سودی رقم بنک میں نہ چھوڑی جائے، بلکہ اس کو نکال کر، بلانیت، صدقہ کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اگرچہ وہ سود ہے جس کی حرمت پر نصوص صریحہ اور اجماع امت ہے، لیکن بنک میں چھوڑنے سے ایک سودی ادارہ کا تعاون ہو گا اور اس کے سودی کاروبار میں مزید ترقی ہو گی، جو تعاون علی الاثم و العدوان ہے، جس کی مخالفت نص قرآنی سے ہے۔ اس لیے **واذ بتلی ببلیتین فلیختر اھونھما** کے اصول کے پیش نظر اس رقم کو نکال لینا ہی راجح ہے۔

بنک کی سودی رقم نکال لینے کے بعد اس کے مصارف کے سلسلے میں تقریباً تمام علما اس پر متفق ہیں کہ اس کو نکال کر، بلانیت ثواب، فقرا و مساکین پر صدقہ کر دیا جائے، اور ناروا و غیر واجبی ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس وغیرہ بھی دے سکتے ہیں۔ (غیر واجبی ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی نفع مسلمانوں کو نہ

پہنچتا ہو)۔ البتہ ان کے علاوہ مسلمانوں کے مفاد عام میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں ' اس میں علما کے دو گروہ نظر آتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی ' مفتی عزیز الرحمٰن اور مفتی شفیع صاحبان اور دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مفتیان کرام کی رائے یہ ہے کہ اس کو فقرا و مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے ' رفاہ عام میں صرف نہیں کر سکتے ہیں۔ ان حضرات کے پیش نظر لقطہ اور مال حرام کا حکم ہے کہ جب مالک کا پتہ نہ ہو تو ان کا تصدق واجب ہے۔ فقہا نے ان جیسے اموال کے لیے تصدق کا لفظ استعمال کیا ہے ' اور تصدق میں تملیک کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ گویا کہ ایسی جگہوں پر صرف کرنا صحیح نہیں جہاں مالک بننے کی صلاحیت نہیں۔

مفتی کفایت اللہ ' مفتی عبدالرحیم لاجپوری ' مفتی سعید احمد ' مفتی اعظم مظاہر ' مولانا حسین احمد مدنی صاحبان کی رائے یہ ہے کہ اس کو مسلمانوں کے مفاد عام میں صرف کر سکتے ہیں۔ مولانا مدنی تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اس کو نکال کر سمندر میں پھینک دینا ' بہتر ہے بینک میں چھوڑنے سے۔ یوسف قرضاوی اور عبداللہ بن باز کا فتویٰ بھی جواز کا ہے۔ ان حضرات نے عام طور پر فقہا کی عبارت وما اوجف المسلمون علیه من اموال الحرب بغیر قتال یصرف فی مصالح المسلمین سے استدلال کیا ہے۔

راقم الحروف کا رجحان بھی جواز ہی کی طرف ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے لاکھوں اور کروڑوں روپے بنک کے اندر سود کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ رقم بنک ہی میں چھوڑ دی جائے ' یہ صحیح نہیں ہے۔ یا اس کو نکال کر سمندر وغیرہ میں پھینک دیا جائے ' اس کی اجازت نہ شریعت دیتی ہے اور نہ ہی کوئی عقل مند انسان۔ اس لیے اس کو لامحالہ رفاہ عام میں صرف کرنا ہوگا۔

یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ فقہا نے مال حرام کے لیے لفظ تصدق استعمال کیا ہے اور لفظ تصدق میں تملیک کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ لفظ تصدق ' صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے ' جیسا کہ فقہا نے قربانی کے جانوروں کی کھال اور ان کو فروخت کر دینے کے بعد اس کی قیمت ' دونوں ہی کے لیے تصدق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مگر کھال کا تصدق واجب نہیں ہے ' بلکہ خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور کسی مالدار کو بھی دے سکتا ہے ' البتہ اس کو فروخت کر دینے کے بعد اس کی قیمت کا تصدق واجب ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ لفظ تصدق کا استعمال صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لیے ہوتا ہے۔

فقہا کی عبارت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ جس کے پاس مال حرام ہے اس پر ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر کے اپنے آپ کو گناہ سے بری کر لے۔ لیکن کیا اس

کے مصارف وہی ہوں گے جو صدقات واجبہ کے مصارف ہیں، اس کی صراحت نہیں ملتی۔ جن حضرات نے اس کے مصارف صدقات واجبہ کے مصارف کو قرار دیا ہے، ان کے پیش نظر لفظ تصدق ہے۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ تصدق، صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مالک کا پتا نہ ہونے کی صورت میں مال حرام کا تصدق محض اس نیت سے ہے کہ اصل شے نہیں تو کم از کم اس کا ثواب ہی مالک کو پہنچ جائے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح فقرا اور مساکین پر صدقہ کرنے سے مالک کو ثواب ملے گا اسی طرح رفاہ عام میں صدقہ کرنے سے بھی ثواب حاصل ہو گا۔ بلکہ احادیث میں رفاہ عام میں صدقہ کرنے کو صدقہ جاریہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا میری ناقص رائے میں مال حرام کے تصدق کا مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس مال حرام ہے اس پر ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر کے اپنے آپ کو گناہ سے بری کر دے، لیکن اس کے مصارف وہی ہوں جو صدقات واجبہ کے مصارف ہیں، ضروری نہیں ہے۔

نیز لقطہ کے مشابہ مان کر عدم جواز کا فتویٰ دینا دو وجہوں سے صحیح معلوم نہیں ہوتا: اول، یہ کہ لقطہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ لقطہ میں مالک کا علم نہیں ہوتا ہے اور یہاں پر مالک کا علم ہے۔ لقطہ میں مالک کی طرف مال کا لوٹانا ضروری ہے، اور یہاں پر لوٹانے کے بجائے لینا ضروری ہے۔ ثانیاً، اگر لقطہ کے مشابہ مان لیا جائے تب بھی فقرا پر تصدق ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ لقطہ کو مسلمانوں کے مفاد عامہ میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہا کی عبارتیں مختلف ہیں۔ صاحب درمختار نے جواز کے پہلو کو اختیار کیا ہے، اگرچہ شامی نے صاحب ہدایہ وغیرہ کی عبارت سے عدم جواز ہی کے پہلو کو راجح قرار دیا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے 'فتاوی رحیمیہ' جلد سوم)

۶۔ محمد عبید اللہ الاسلامی، باندہ

جہاں تک سوال ہے حاصل کردہ سود کے مصرف کا، تو فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ معروف ہے۔ مولانا برہان الدین صاحب کے مطابق، یہ امر متفق علیہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی ایسا مال ہے جس کو وہ اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا تو دو راستے ہیں: اگر مالک معلوم ہے تو اس تک پہنچائے جیسے کہ غصب کردہ مال یا لقطہ کا عام حکم ہے۔ اگر مالک معلوم نہیں ہے اور اس کا حصول کسی عقد کے ذریعہ ہوا ہے، اگرچہ عقد غلط ہو جیسا کہ ایک موقع پر شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا ہے، یا مالک معلوم ہے مگر اب کسی طرح اس تک پہنچانا ممکن نہیں کہ نہ وہ خود موجود ہے نہ اس کے ورثا، تو ایسے مال کا حکم یہ ہے کہ اس کو صدقہ کر دیا جائے۔ مولانا سنبھلی نے بواسطہ ابن تیمیہ حنابلہ سے، اور بواسطہ قرطبی مالکیہ سے بھی یہی حکم نقل کیا ہے، اور احناف کے یہاں تو یہ حکم ہے ہی۔ شامی وغیرہ میں لقطہ، غصب، رشوت سب کا حکم اسی قسم کا آیا ہے۔ (شامی، ج ۳، ص ۳۲۳)

لقطہ یا غصب کا حکم مالک تک لوٹا دینے وغیرہ کا نصوص صریحہ صحیحہ سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ حکم شوافع کے یہاں بھی ہے۔

چونکہ سود کو غصب و لقطہ سے مناسبت ہے، اس لیے بنک سے وصول کیے جانے والے سود کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کو لے کر صدقہ کیا جائے۔ مفتی عبدالرحیم صاحب نے لقطہ ہونے کی حجت کو یہ کہہ کر رد کیا ہے اس کے مالک نامعلوم ولاپتہ بھی نہیں، اور ان کو پہنچانے سے معذوری بھی نہیں ہے، اور یہ رقم واجب الرد بھی نہیں ہے، پھر بینک میں دی ہوئی عین رقم تو واپس ہوئی ہی نہیں۔ مگر کہا جا سکتا ہے کہ اس کو (عین لقطہ) کون کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غصب، رشوت، لقطہ، سود سب کے الگ حقائق ہیں۔ البتہ باہم ایک مناسبت اور قدر مشترک ہے جس کی بنا پر احکام میں توافق ہو سکتا ہے، اور ہے۔ سود کے صدقہ کر دینے کے حکم سے، دلیل کے طور پر، مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ کو ذکر کیا ہے۔ معارف السنن میں بواسطہ دارقطنی، حضرت امام صاحب سے ایسے اموال کے حق میں ایک روایت کو اصل بتانا نقل کیا گیا ہے۔ یہ روایت عاصم ابن کلیبؒ کی ہے، جس میں یہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ ایک گھر میں مدعو تھے، کھانے میں بکری کا گوشت تھا۔ آپؐ نے گوشت کی بوٹی منہ میں رکھنے کے بعد فرمایا کہ بکری مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے۔ تحقیق سے یہی ثابت ہوا، تو آپؐ نے فرمایا: اسے قیدیوں کو کھلا دو۔ ابو داود کی ایک دوسری روایت سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، جس میں آپؐ نے، پچھنا لگانے کی اجرت کو بار بار استعمال میں لانے کی اجازت طلب کرنے پر، فرمایا اسے اپنے جانور یا غلام کو کھلا دو۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ذکر فرمایا ہے کہ حدیث میں ہے کہ ایسے مال کا یا تو تبادلہ کر لے، یا گھوڑے یا خادم کو کھلا دے، یا کافر کو اجرت میں دے دے۔ (ملفوظات عزیزی، ص ۳۷) مگر یہ حدیث کہاں کی ہے، اور کیسی ہے، یا حدیث ہے بھی یا نہیں، تحقیق نہیں ہو سکی۔

بہرحال نصوص صریحہ وصحیحہ سے ثابت اس اصل و قاعدہ کی بنا پر سود کا جو مصرف عموماً علما نے تجویز کیا ہے وہ اس کو صدقہ کر دینا ہے۔ بقول مولانا سنبھلی جدہ کے اندر ۱۳۹۹ میں منعقد ایک فقہی و علمی مجلس کے مختلف ملکوں کے شرکا نے اس کو بالاتفاق طے کیا، اور ہمارے اکابر تو عرصہ سے یہ فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ سود کا جیسے دینا حرام ہے لینا بھی حرام ہے، اور یہ کہ استعمال جیسے اغنیا کو منع، ویسے فقرا کو بھی منع ہے۔ شق اول کا جواب یہ ہے کہ جواز، بربنائے ضرورت--- اسلام اور مسلمانوں کو ایسے ضرر شدید سے بچانے کے لیے ہے کہ جو سود لینے کے ضرر سے بڑھ کر ہے۔ (نظام الفتاوی، ج ۱، ص ۳۲۹) اور شق ثانی کا جواب یہ ہے کہ فقرا کے لیے حلت اس لیے ہے کہ سود کا

مال اصلاً بینک کی ملک نہیں ہے، دوسرے سود دینے والوں کی ہے جو ہم کو معلوم نہیں۔ اب سود لینے والا اصلی مالک کو تو لوٹا نہیں سکتا، تو لقطہ کی طرح اس کی طرف سے صدقہ کر دیتا ہے۔

اس صورت میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی غریب کو دے دے، مسلمان ہو یا غیر مسلم، یا یہ کہ مسلمان و مستحق کی تخصیص ہے۔ مفتی نظام الدین صاحب کا میلان یہ ہے کہ تخصیص ہے۔ مفتی عبدالرحیم صاحب نے اولیٰ ضرور کہا ہے، مگر ضروری قرار نہیں دیا۔ باقی حضرات نے کوئی قید نہیں لگائی۔ بس یہ فرماتے ہیں کہ فقرا و مساکین و اہل حاجت کو دے دے۔ جو احادیث بطور استدلال یا مناسبات ذکر کی گئی ہیں، ان سے تو اس کی تائید ہوتی ہے کہ کوئی قید نہیں ہے۔ اس لیے کہ عاصم ابن کلیبؒ کی روایت میں آیا ہے کہ قیدیوں کو کھلا دو، اور وہاں قیدی کفار ہی ہوتے تھے۔ دوسری روایت میں خادم کا ذکر ہے، جو کہ غیر مسلم بھی ہوتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ایسے مال کا صدقہ کرنا واجب ہے، جس سے تخصیص کا خیال ہوتا ہے کہ صدقاتِ واجبہ کا مصرف مسلمان ہی ہیں۔ ذمی کو صرف فطرہ مل سکتا ہے، مگر یہاں ذمی کہاں۔ مفتی عبدالرحیم صاحب نے حضرت تھانوی کی "الطرائف و الظرائف" سے یہ نقل کیا ہے کہ صدقہ واجبہ اور تصدق واجب کے درمیان فرق ہے، اور دونوں کے مصرف کا ایک ہونا ضروری نہیں ہے۔ مال دار لقطہ کا مستحق ہے، جو کہ واجب التصدق ہے مگر صدقہ واجبہ کا نہیں۔ ایسے ہی قربانی کی کھال اور اس کی قیمت کو صدقہ کرنے کا حکم ہے مگر کھال کسی کو دے سکتا ہے۔

دوسرا مصرف یہ فرمایا ہے کہ اس رقم کو غیر شرعی سرکاری ٹیکس میں لگا دیا جائے، غیر شرعی کا معیار یہ ہے کہ ایسا ٹیکس جس کی بظاہر کوئی منفعت ہم کو نہ حاصل ہو رہی ہو، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس میں۔ لیکن واٹر ٹیکس وغیرہ میں نہیں۔ البتہ مفتی عبدالرحیم صاحب بدرجہ مجبوری جبکہ ٹیکس ادا کرنے کی حیثیت نہ ہو یا بہت بوجھ ہو تب اس کی اجازت دیتے ہیں ورنہ نہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک یہ مصرف صدقہ پر مقدم اور اس سے اولیٰ ہے۔ اگرچہ اس مصرف میں لگانے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے "مال حرام بود بجائے حرام رفت"، مگر اصل بنا اس کی جو قاعدہ پیچھے گزر چکا ہے اس کی ایک شق پر ہے، کہ مملوک غیر حتی الامکان مالک تک پہنچانا چاہیے۔ بنکوں سے ملنے والے سود میں اگرچہ یہ احتمال شامل ہے کہ بنک کے قرض داروں سے لیے ہوئے سود سے کھاتے داروں کو سود دیا جاتا ہے مگر بنک تجارت بھی کرتا ہے۔ پھر کھاتے دار کا معاملہ تو براہ راست بنک سے ہی ہے اس لیے اس کا اصل مالک بنک اور حکومت ہی ہیں، تو کسی عنوان سے حکومت کو لوٹانا، اصل مالک کو لوٹانا ہے اور بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تیسرا صرف، جسے ارباب افتا میں سے مفتی عبدالرحیم صاحب نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے،

ایک موقع پر مدلل و مبرہن کر کے پیش کیا ہے ' اور بظاہر یہ ان کے نزدیک ٹیکس سے مقدم ہے وہ یہ ہے کہ اسے عام مسلمانوں اور رفاہ کے عام کاموں میں استعمال کیا جائے ۔ یعنی دین کی نشر و اشاعت ' کوئی قومی و ملی کام و خدمت ' یتامی و مساکین کی امداد ' طلبہ کے وظائف ' مسافرخانہ و کنواں کی تعمیر ' سڑکوں کی روشنی ' عوامی بیت الخلا اگرچہ مسجد کا ہو ' وغیرہ میں اسے صرف کیا جا سکتا ہے ۔

اس مضمون کے متعدد فتاویٰ ' مفتی کفایت اللہ صاحب سے ' نیز مفتی سعید احمد صاحب (سہارن پور) ' مولانا مدنی ' اور بعض علما مراد آباد سے منقول ہیں ۔ مفتی عبدالرحیم صاحب نے لقطہ کے درجہ میں ہونے سے انکار کیا ہے ' مگر کہا ہے کہ لقطہ بھی ہو تو بھی یہ مصرف ہو سکتا ہے کہ اسلامی بیت المال کے اموال میں ایک جہت یہ بھی ہوتی ہے ۔ ان حضرات نے اس کی اصل یہ قرار دی ہے ۔ فقہ حنفی کی کتابوں میں کتاب ایسر کے مسائل کے تحت یہ مسئلہ آیا ہے ۔ اہل حرب کا جو مال مسلمانوں کو ' اہل حرب سے جنگ کے بغیر حاصل ہو ' جسے شریعت کی اصطلاح میں ''فے'' کہتے ہیں ' اس کا مصرف مسلمانوں کے مصالح ہیں جس کے تحت یہ سارے امور آجاتے ہیں ۔

مولانا گیلانی نے ہندوستان یا دارالحرب میں سود لینے کے جواز کے سلسلے میں جو مضمون لکھا ہے اس کی بنا اسی پر ہے کہ یہ ''فے'' ہے لہٰذا اس کو وصول کرنا چاہیے بلکہ اس کا نہ لینا قومی و وطنی جرم ہے ۔ مولانا گیلانی کے پورے مضمون کی تردید تو مودودی صاحب نے کر دی ہے اور فقہ حنفی کی رو سے ' وہاں دیکھنے کے لائق ہے ۔

مگر یہاں یہ عرض ہے کہ عموماً جو ہمارے حضرات نے اس شق کو نہیں اختیار کیا ہے اس کا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے کاموں میں صرف کرنے پر خود ایسی چیز سے ' براہ راست صرف کرنے والا بھی فائدہ اٹھائے گا ' اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے منع ہے ۔ بقول مفتی نظام الدین صاحب اس کو تو حاصل کرنے والا نہ خود استعمال کر سکتا ہے اور نہ کسی طرح ضائع کر سکتا ہے ' راستہ صدقہ ہی ہے ۔ (نظام ' ج ۱ ' ص ۳۶۷)

(ترتیب و تدوین: خرم مراد)

ترجمان القرآن کے پیغام کی اشاعت میں حصہ لیجیے

ایجنسی لیجیے اور اپنے اعزہ و احباب میں ' اہل محلّہ اور رفقاے دفاتر میں ' بازار کے دوکانداروں میں ' کالجوں اسکولوں اور مدارس میں فروخت کیجیے

۵ سے زائد پرچوں پر ۲۵٪ ۔ ۲۵ سے زائد پرچوں پر ۳۳٪

مینیجر ' ۵ اے ذیلدار پارک اچھرہ ' لاہور ۔ ۵۴۶۰۰